# فکر اقبال پر ہملٹن گب کی تنقید کا جائزہ☆

ڈاکٹر شکری الباجی / حسنین عباس

Allama Iqbal's poetry and thought have been the subject of research and criticism by scholars in the East and the West. The West has criticized Allama Iqbal's poetry and thought and philosophy from a specific angle. The analysis of Allama Iqbal's thought and philosophy by Western thinkers cannot be considered completely neutral. If one studies the writings written by Western scholars, philosophers, researchers and Orientalists in this regard, then this point comes to the fore. Among the Western thinkers and Orientalists, Hamilton Gibb is a name whose writings on Allama Iqbal help us understand the mind of the West. Gibb has discussed the well-known philosophical book of Allama Iqbal, the Reconstruction of Religious Thought in Islam. He has refrained from acknowledging the real greatness of Allama Iqbal there. There can be no other opinion that this book of Allama Iqbal is the foundation of modern Islamic theology. In his writings, Hamilton Gibb compares Allama Iqbal's thought and philosophy to Bergson's illogical philosophy, relies on intuitive experience to prove his position rather than scientific reasoning, and analyzes Allama Iqbal's criticism of Western institutions. In this article, Gibb's ideas have been analyzed which are the manifestation of Gibb's falsities and fallacies regarding Allama Iqbal's thought and philosophy.

علامہ اقبال کے انتقال کو سات دہائیوں سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس دوران عالم عرب، مسلم دنیا اور مغرب میں علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء/ ۱۲۹۴ - ۱۳۵۷ھ) پر ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں

☆ زیتونہ یونیورسٹی تیونس اور سفارتخانہ اسلامی جمہوریہ پاکستان تیونس کے اشتراک سے دوسری بین الاقوامی انٹلکچوئیل کانفرنس ''محمد اقبال: الاستشراق والمستشرقون'' منعقدہ ۳۰/ مارچ ۲۰۲۲ء بمقام زیتونہ یونیورسٹی میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

تصانیف اور مقالہ جات کا ایک بہت بڑا اور وسیع ذخیرہ مرتب ہو چکا ہے جس میں علامہ اقبال کے شعر و نثر اور ادبی و فکری لحاظ سے ان کی فکر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تفصیلی مطالعات اور لکھی گئی کتب سے علامہ اقبال کی فکر پر تحقیق اور تفصیلی غور و فکر کیے جانے کا اندازہ ہوتا ہے یعنی آج علامہ اقبال کو نمایاں کرنے یا ان کی تعریف و توصیف کرنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان کی مدح و توصیف پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم علامہ اقبال کے فکری مباحث کے احیاء اور ان کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال کو آج بھی علمی و فکری حلقوں میں اہم مقام حاصل ہے اور آج بھی وہ اہل علم کے غور و فکر اور علمی تحریک کی دلچسپی کا باعث اور اہم موضوع ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار پر غور و فکر اور تحقیق کی علمی ضرورت آج بھی اتنی نمایاں اور اہم ہے کہ ان کے اشعار اور تحریروں کے معنی کی گہرائی کو دریافت کیا جائے۔ ان کے افکار کا مشرقی اور مغربی علمی حلقوں، اہل فلسفہ، محققین، مستشرقین اور فکری روایات کے تناظر میں ان کا انتقادی اور تقابلی جائزہ لیا جائے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور ان کی شاعری اور نثر اور اس میں دیے گئے پیغام کو آج کیوں موضوع بحث و تحقیق بنایا جائے۔ علامہ اقبال کے افکار میں کون سی ایسی بات باقی ہے جسے موضوع تحقیق بنایا جا سکتا ہے یا جس پر کسی نئے تصور علم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

اس سوال کا جواب کیسے ممکن ہے جو علامہ اقبال کی فکر کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں اس طرح کے کئی سوالات کیے جاتے ہیں۔

اس طرح کے سوالات ہم سے بغیر کسی خوف یا عدم اعتماد کے ہمت اور تحقیق و جستجو کا مطالبہ کرتے ہیں اور فکر اقبال کی اہمیت کو کم کرنے والی اس طرح کی باتوں کے ازالے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فکر اقبال کی توضیح و تشریح کے ضمن میں پہلے سے کہی گئی باتوں کو نہ دہرایا جائے اور علامہ اقبال کی فکر کے مقصود کو بیان کرنے کے لیے پہلے سے موجود مباحث کو دہرانے کی بجائے ہم فکری تازگی کے ساتھ اپنے مباحث کو آگے بڑھائیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال[۱] جو اپنے والد علامہ اقبال کی سوانح حیات کے مصنف بھی ہیں،[۲] نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال کی شخصیت، شاعری اور ان کے علمی ورثے پر اہل علم کی تحقیق اور تصنیفات کے باعث علامہ اقبال کا مطالعہ ایک شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس میں بہت سے اہل علم و فضل اور محققین اپنی تحقیقات پیش کر رہے ہیں۔ ان اہل علم کی علمی کاوشوں اور تحقیقات کے ذخیرے سے استفادہ نہ صرف ہمارے شعور کو منور کرتا ہے بلکہ تفہیم اقبال کے راستے کو بھی آسان بناتا ہے۔

اس تناظر میں اہل علم کے ایک طبقے نے جب علامہ اقبال پر تحقیق اور بحث مباحثہ شروع کیا تو انہوں نے علامہ اقبال کا تقابل قدیم اسلامی مفکرین مثلاً الفارابی اور ابن سینا یا دور وسطی کے مسلم مفکرین مثلاً امام

غزالی، ابن رشد اور ابن خلدون یا دور جدید کے نمایاں مستند اہل فکر مثلاً جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے ساتھ کیا جو کہ اپنی کثرت تصانیف اور علم و تحقیق کی وجہ سے مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بن چکے ہیں۔ اس طرح بغیر کسی رکاوٹ، توقف یا عدم لگاؤ کے مختلف طرح کے علمی اور فکری مواد مرتب ہوتے چلے گئے۔

اہل علم کی اسی دلچسپی کے باعث یہ نکتہ بہت اہمیت اختیار کر گیا کہ علامہ اقبال کے اس بلند مقام کے پیچھے کارفرما اسباب کا کھوج لگایا جائے جن کے باعث علامہ اس بلند منصب پر فائز ہوئے تاکہ ان میں اہل علم کی مسلسل تحقیقی دلچسپی برقرار رہے اور جب کبھی مذہبی فکر کے احیاء اور اس سے متعلقہ مباحث کا تذکرہ ہو تو علامہ اقبال کا ذکر بھی ہمارے مباحثوں کا حصہ رہے۔

پس یہ سوال ہمارے پیش نظر رہتا ہے کہ وہ کیا بنیاد تھی جس نے علامہ اقبال کو اتنے بلند مقام پر فائز کر دیا۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ علامہ اقبال کے بارے میں ہونے والے علمی مباحث نے ان کے گرد چار طرح کے انتقادی اور تحسینی موقف کھڑے کر دیے جو اپنے نقطہ آغاز اور ماحول کی وجہ سے مختلف ہیں جو عرب دنیائے اسلام، یورپ، مصر، ایران، پاکستان اور برطانیہ وغیرہ کے ماحول سے متعلق ہیں اور ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اول: یہ وہ تنقیدی نقطہ نظر ہے جو ہملٹن گب نے بیان کیا [۳] اور اس کی تشریح اپنی کتاب *Modern Trends in Islam* میں بیان کی۔ یہ کتاب دار ہاشم الحسینی، مکتبہ الحیاۃ بیروت سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

دوم: دوسرا موقف محمد البھی [۴] نے اپنی کتاب الفکر الاسلامی الحدیث وصلۃ بالاستعمار الغربی میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ [۵]

سوم: تیسرا موقف شیخ مرتضی المطہری [۶] نے اپنی کئی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

چہارم: چوتھا تنقیدی اور تحقیقی موقف فضل الرحمان کا ہے [۷] جس کی وضاحت انہوں نے اپنی کتاب *Islam and Modernity* میں بیان کیا۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ [۸]

اسی دائرہ کار میں رہتے ہوئے اسلامی علوم میں مہارت رکھنے والے مشہور انگریزی مستشرق ہملٹن گب نے اپنی کتاب *Modern Trends in Islam* [۹] میں اس بحث کا آغاز کیا ہے اور یہ بحث علامہ اقبال کے بنیادی تصورات اور نظریات کی ابتدائی بحثوں میں سے ایک ہے۔ اس بحث کو ہم نے اس لیے اپنا موضوع بنایا ہے کہ اس کا آغاز معروف نقاد ایڈورڈ سعید کے مطابق ایک اہم علمی شخصیت یعنی ہملٹن گب نے کیا ہے۔ اس کا ذکر ایڈورڈ سعید [۱۰] نے اپنی کتاب *Orientalism* میں کیا ہے۔ [۱۱] ایڈورڈ سعید کو اینگلو امریکن دنیا میں اسلامی علوم کے شعبے سے متعلق نمایاں لوگوں میں شمار کیا ہے۔ مشہور مستشرق جون فوک [۱۲]

نے اپنی کتاب History of the Orientalist Movement میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۱۳] جہاں اس نے ایڈورڈ سعید کو امریکہ میں عرب اور اسلامی علوم کا ایک لحاظ سے پہلا نمائندہ قرار دیا ہے۔ عبدالمجید القیسی نے بھی ہملٹن گب کو معروف برطانوی اور مستشرق قرار دیا ہے انہوں نے گب کی کتاب The Islamic Society and the West[۱۴] کا ترجمہ بھی کیا ہے جسے ہملٹن گب نے ۱۹۵۰ء میں ہیرلڈ باؤن کے ساتھ مل کر شائع کیا تھا۔

لیکن معروف سکالر عبدالرحمٰن بدوی (۱۹۱۷-۲۰۰۲ء)[۱۵] کے مطابق گب کو جتنی شہرت ملی وہ اس کے علمی مرتبے سے کہیں زیادہ تھی کیونکہ جو کچھ اس نے لکھا یا علمی طور پر جو خدمات انجام دیں اس کی اہمیت اس شہرت سے کہیں کم ہے جو اسے ملی۔[۱۶]

اس تناظر میں جب ہم گب کے علمی کاموں کو دیکھتے ہیں تو اس نے ملی نشاۃ ثانیہ کے میدان میں دو اہم شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے مصر کے شیخ محمد عبدہ[۱۷] اور برصغیر کے علامہ محمد اقبال۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ گب سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر کام کیا مصر اور عالم عرب کے حوالے سے بطور خاص محمد عبدہ ہی کو اس کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے موضوع بنایا۔ جیسا کہ چارلس ایڈمز[۱۸] نے اپنی کتاب Islam and Modernity of Egypt میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۱۹] یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

اس حوالے سے تھامس آرنلڈ[۲۰] بھی قابل ذکر ہیں جو ان دونوں کے استاد بھی تھے اور تھامس آرنلڈ کے انتقال کے بعد لندن یونیورسٹی میں چیئر آف عریبک لینگوئجز پر ہملٹن گب ۱۹۳۰ء میں فائز ہوئے اور وہی ان کے بعد اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے برطانوی ایڈیشن کے مدیر بھی بنے۔[۲۱]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہملٹن گب علامہ اقبال کے ہم عصر تھے لیکن انہوں نے علامہ اقبال کے انتقال کے سات برس بعد تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تا آنکہ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے Hescal Institute for Study of Comparative Religion میں ایک لیکچر پروگرام کے تحت اس پر گفتگو کا آغاز کیا جو وہاں ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ یہ لیکچر امریکن یونیورسٹی آف شکاگو کے تحت بعد ازاں ۱۹۴۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہملٹن گب کی طرف سے شروع کی گئی یہ ساری بحث یک طرفہ تھی جو کسی بھی علمی معاملے پر ہونے والی بحث کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ کسی بھی علمی معاملے پر بحث و مباحثہ کو اگر بامقصد اور نتیجہ خیز بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں فریق موجود ہوں تاکہ ان کے بیان کیے گئے نقطہ نظر کا تقابل کیا جا سکے اور اعتدال کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔ اور پھر ان کی طرف سے پیش کیے گئے نقطہ ہائے نظر سے بننے والی حتمی رائے پر محققین اور اہل علم جو اسلامی علوم اور دینی نشاۃ نو کے میدان میں تحقیق کر رہے ہیں ان کے لیے کسی نقطہ نظر پر پہنچنا بھی آسان

ہوتا ہے۔ ہملٹن گب کے اندازِ گفتگو سے یوں لگتا ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کے تمام افکار کا تجزیہ اور ان کے استدلال کا بیان بہت ہی التباس، مغالطوں اور تضادات کے ساتھ کیا اور ان کا یہی اسلوب ان کی بعد کی بھی ساری علمی کاوش میں غالب نظر آتا ہے۔ جو بنیادی طور پر علامہ اقبال کی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam پر مبنی ہے۔

گب ان مباحث میں مغالطوں اور التباسات کا شکار کیوں ہوئے اس کے بنیادی تین اسباب ہیں:

پہلا سبب یہ ہے کہ ہملٹن گب کی تحقیق کا ماخذ The Reconstruction of Religious Thought in Islam ہے۔ وہ اس کتاب کا دورِ جدید کی روح کے ساتھ تعلق واضح کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک مصر اور عرب دنیا کے بعد برصغیر نے اسلامی سوچ کے فروغ کے لیے مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی اور یہ دورِ جدید کے قریب بھی تھا جو مغرب کے تصورات سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ دوسرا سبب ہملٹن گب یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ علامہ اقبال نے جدید اسلامی کمیونٹی کے لحاظ سے اس کی نمائندگی کیسے کی؟ تیسرا سبب ہملٹن گب کے خیال میں علامہ اقبال نے اپنے ان خطبات کے ذریعے اپنی مسلم علم الکلام کی تشکیلِ نو کرنے کی پہلی مکمل کوشش کی۔[۲۲]

ہملٹن گب کے مطابق علامہ اقبال ہندوستان میں وہ شخصیت ہیں جن کے رجحانات اور فکری روش کو نہ صرف ہندوستان کے عوام نے قبول کیا بلکہ وہ بھی مسلم دنیا میں جاری رجحانات کی فکری روش کے اس حد تک نمائندہ تھے کہ ان کی شاعری ان سب حقائق کو بیان کرنے والی ایک آئینہ بن گئی جن میں لبرل رومانویت، نوجوانوں کے اجتماعی رجحانات اور ان کے لیے آزادی کی تڑپ شامل ہے[۲۳]۔ مزید برآں ہندوستان کے وہ تمام مسلمان جو اپنے دور کے مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل کی وجہ سے پریشان تھے وہ علامہ اقبال کی شخصیت میں ایک ایسا رہنما دیکھ رہے تھے جو انہیں آزادی کی منزل کی طرف بلا رہا تھا۔[۲۴]

ہملٹن گب کہتا ہے کہ علامہ اقبال جدید اسلامی معاشرے کی اہم تصویر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بیان کرنے کے بعد وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال علمی سطح پر ہونے والی کاوشوں کے منفی رجحانات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ وہ اس طرح کہ علامہ اقبال نے وطنیت کے تصور پر سخت تنقید کی حالانکہ ان کی شاعری اور نظمیں ہی بعد ازاں ہندوستان کا قومی ترانہ بھی بن گئیں۔ اقبال نے پاکستان کی ریاست کے قیام کی وکالت بھی کی لیکن ان کی شاعری کئی طرح کے تضادات سے بھری پڑی ہے گو ان کے بعد کے شارحین نے ان تضادات کو رفع کر کے ان میں ایک نظم اور ربط تلاش کرنے کی کوشش بھی کی۔[۲۵]

اپنی کتاب کے آخر میں ہملٹن گب یہ بیان کرتا ہے کہ علامہ اقبال نے جو علمی نتائج بیان کیے ہیں وہ بہت ناقص ہیں۔ علامہ اقبال پر ان کے شارحین اور بعد کے مصنفین کے کام پر تنقید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے

کہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز اذیت ناک نظر نہیں آتی کہ علامہ اقبال پر اکثر کام کرنے والے سکالرز اپنے ممدوح کے علمی حاصلات کو بار بار دہرانے کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں کرتے۔[۲۶]

ہملٹن گب کی تحقیق اور غور وفکر کا مرکز علامہ اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* ہے۔ کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جو اسلام میں جدید رجحان کے موضوع کے ساتھ براہ راست متعلق ہے۔ یہ کتاب غیر معمولی طور پر علم الکلام کی تشکیل نو کرنے والی پہلی مکمل کوشش بھی ہے تاہم یہ امر حیران کن ہے کہ ہملٹن گب اپنی پوری بحث کے دوران اس کتاب کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے وہ الٰہیات اسلامی کا ذکر کرتے ہوئے وہ چھ خطبات کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی گویا یہ کتاب نہیں بلکہ فی الاصل چھ لیکچرز ہیں۔ اقبال پر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہی گب کہتا ہے کہ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید پر اپنے چھ خطبات میں محمد اقبال نے مسلم علم الکلام کے ایک منظم نظام کو تشکیل دینے اور اسلام کے بنیادی تصورات کو منضبط کرنے کے مسئلے پر گفتگو کی ہے۔[۲۷]

اس طرح ہملٹن گب علامہ اقبال کے تصورات پر اپنی گفتگو اور تحقیق کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اس کتاب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے بلکہ اس کتاب کے بجائے ان کی معلومات ان کے لیکچر ہونے کی حیثیت تک ہے جس کا عنوان پہلے لیکچر سے لے کر چھٹے لیکچر تک ہے جیسا کہ وہ اپنی گفتگو میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

جہاں تک علامہ اقبال کی فکر میں تضادات اور التباسات کا معاملہ ہے ہملٹن گب کہتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبات کا آغاز جس مقصد سے کیا تھا خطبات کے اختتام اور تکمیل پر وہ اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکے جو انہوں نے خود متعین کیا تھا یعنی موجودہ مسلم علم الکلام کی تشکیل نو اور اس کے لیے بطور مذہبی فکر کی تعمیر نو کے اور یہ کہ جو انہوں نے کہا تھا کہ وہ مذہبی فکر کی تعمیر نو اور تشکیل نو کریں گے بلکہ اس کے بجائے ان کے خطبات کا حاصل صوفیا کے طریق پر وجدانی تجربہ ہے۔ اور اس کے ڈانڈے غیر منطقی رومانویت کے بابا آدم اور بڑے نمائندہ برگساں کے ساتھ جا جڑتے ہیں۔[۲۸] بلاشبہ جیسا کہ ہملٹن گب نے اسے بیان کیا ہے۔[۲۹]

مغربی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں علامہ اقبال کے تناقضات اور تضادات کو بیان کرتے ہوئے ہملٹن گب دو بنیادی دلائل پیش کرتا ہے:

ا۔ ہملٹن گب یہ سمجھتا ہے کہ ایک طرف تو علامہ اقبال مغربی کلچر کا دفاع کرنے والے بڑے نمائندے کے طور پر سامنے آتے ہیں کیونکہ وہ خود اس سے بہت متاثر ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مغربی اداروں اور تنظیمات پر سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔

۲۔ جب ہملٹن گب یہ بیان کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کے خطبات کا حاصل ان کے مقاصد کے برعکس ہے تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب میں پیدا ہونے والے علمی اور فکری رجحانات جنہوں نے بتدریج عیسائیت کو ایک انسانی مذہب میں بدل دیا کیونکہ اب ان کا انحصار سائنسی غور وفکر اور قوانین فطرت کے حوالے سے موجود تصورات پر بہت زیادہ انحصار ہو چکا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلم دنیا میں پیدا ہونے والے یہ رجحانات اسلامی عقاید اور دین کو بھی اسی طرح کے مطالعات کے نتیجے میں انسانی مذہب میں بدل دیں۔ گب اس بات پر زور دیتا ہے کہ اقبال کے فلسفے میں انسانی رجحانات کہیں ایسے ہی نتائج نہ پیدا کریں کیونکہ اس کی بنیاد ہمیں برگساں کے غیر منطقی فلسفے میں نظر آتی ہے۔[۳۰]

ہملٹن گب کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کی فکر کی ایک کمزوری جس کی وجہ سے وہ اپنے دور کے دوسرے مجددین میں کھڑے نظر آتے ہیں یہ ہے کہ وہ خطبات میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے تسلسل کے ساتھ قرآن مجید کی آیات کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ گب نے علامہ اقبال کی اس روش پر دو سوالات اٹھائے ہیں:

پہلا سوال یہ کہ کیا قرآن مجید کی بطور حوالہ بیان کردہ یہ آیات قرآن مجید کے اس حوالے سے تمام نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتی ہیں دوسرا سوال یہ کہ کیا اقبال کے دیے گئے یہ حوالہ جات اس بات کا ثبوت ہیں کہ واقعی اقبال وہی کہنا چاہتے ہیں جو مفہوم ان آیات میں بیان ہوا ہے لیکن اس پر سنجیدہ غور وفکر ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان آیات کے معانی اور ان میں موجود مذہبی اور دینی رہنمائی اور علامہ اقبال کے ان آیات سے اخذ کردہ مفاہیم میں بہت واضح فاصلہ اور بعد نظر آتا ہے۔[۳۱]

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہملٹن گب کہتا کہ اگر علامہ اقبال نے یہ طریق اس لیے اختیار کیا کہ وہ فکری خالصیت اور اصلیت کے ساتھ اپنے موقف کو آگے بڑھا سکیں تو اس اسلوب کو اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اس سے ایک ایسی لغزش کا اضافہ ہوا جس نے الٰہیات اسلامیہ کی فکری تشکیل نو کے سارے منصوبے کو زمین بوس کر دیا۔

علامہ اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought is Islam* پر یہی وہ اہم ترین نقطہ ہائے نظر ہیں جو گب نے علامہ اقبال کی اس تصنیف کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔ ہملٹن گب کے سارے خیالات کا جائزہ لینے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ گب نے تسلسل کے ساتھ علامہ اقبال کی کسی بھی خوبی کی تحسین کرنے سے احتراز کیا ہے اور اگر کہیں علامہ اقبال کے کسی موقف اور دلیل کے ساتھ اتفاق بھی کیا ہے تو وہاں بھی کما حقہ علامہ اقبال کی علمی عظمت کا اعتراف نہیں کیا جیسا کہ اسے کرنا چاہیے تھا بلکہ اس کے بجائے ہر جگہ علامہ اقبال پر اپنی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی اہمیت

اور علمی و فکری مرتبے کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جو ہملٹن کی مذکورہ بالا کتاب میں جا بجا نمایاں ہے۔

گب نے علامہ اقبال کی کسی بھی خوبی کا اعتراف نہیں کیا اور اگر کسی سطح پر کسی جگہ پر علامہ اقبال کی کسی خوبی کا اعتراف بھی کیا تو فوراً اپنے موقف کو بدل دیا مثلاً ایک جگہ گب کہتا ہے کہ ہمیں الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کی کوششوں میں علامہ اقبال کی جرات اور اخلاص کا اعتراف کرنا چاہیے لیکن ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ لیکن اس کام کے لیے جرات اور اخلاص ہی کافی نہیں۔ اور اس طرح سے وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے وہ علامہ اقبال کے لیے جس خوبی کا اعتراف کر رہا تھا اس سے پسپائی اختیار کر لیتا ہے پھر وہ اپنے الفاظ کو اس طرح مکمل کرتا ہے کہ ہم علامہ اقبال کے موقف کا اطمینان کے ساتھ دفاع نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اپنے نئے علم الکلام میں علامہ اقبال نے کچھ ایسی بنیادیں رکھ دی ہیں جنہیں بعد میں آنے والے ایک مکمل اخلاقی نظام وضع کرنے کے لیے مزید توضیح و تشریح کے ساتھ مکمل کر سکتے ہیں جس کی آنے والے دور میں خصوصی اہمیت ہوگی۔[۳۲]

ہملٹن گب کی علامہ اقبال پر تمام تر تنقید ان کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے تناظر میں سامنے آئی۔ گب کی تنقیدات کا عمومی جائزہ لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گب نے علامہ اقبال کے موقف اور علمی عظمت کی تحسین کرنے سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ ان کے کچھ افکار کے ساتھ اتفاق کرنے میں بھی پس و پیش سے کام لیا۔ وہ علامہ اقبال کی عظمت کا کما حقہ اعتراف نہیں کرتے۔ تا کہ اس کی اپنی فوقیت اور برتری قائم رہے اور اپنے تمام خیالات میں علامہ اقبال کی اہمیت کو کم کرنے اور ان کے علمی و فکری مقام و مرتبے کو کمزور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ان کے اپنے احساس برتری سے خالی نہیں ہے۔

ہملٹن گب کے علامہ اقبال کے بارے میں نقطہ نظر کا خلاصہ دو جہات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ ہملٹن گب کی تحقیقات کا رخ علامہ اقبال کے تصورات اور نظریات میں اس کی دلچسپی سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ علامہ اقبال نے ان محققین اور اہل علم کے راستے سے انحراف کیا ہے جنہوں نے مذہب کا دفاع کیا اور ان موقفوں کو بیان کیا جن کا اطلاق فکر جدید پر ہو سکتا ہے۔ گب یہ سمجھتا ہے کہ علامہ اقبال نے مسلم فکر کی تشکیل نو کرنے کی جو کوشش کی وہ اس تصور کی نمائندگی کرتی ہے کہ ایک منظّم مسلم علم الکلام کی تشکیل اسلام کی بنیادی ضرورت اور مرکزی فکر ہے۔ جب گب یہ نقطہ نظر بیان کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علامہ اقبال کا یہ علمی کارنامہ مسلم علم الکلام کی تشکیل نو کی پہلی مکمل کوشش ہے۔[۳۳]

ہملٹن گب کے خیال میں علامہ اقبال کی فکری کاوشیں جدید مسلم معاشرے کی نمائندگی کرنے والا ایک اہم عنصر ہے لیکن جس طرح سے علامہ اقبال نے اپنے اس فکری کارنامے کو تکمیل پذیر کیا وہ ہملٹن گب

کے مطابق علمی مایوسی کا مظہر ہے۔

ہملٹن گب کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبال اس مفکر کی طرح ہیں جنہوں نے برصغیر کی مسلم دنیا میں جاری اور معاصر تمام فکری رجحانات کا احاطہ کیا۔ علامہ اقبال کی صورت میں برصغیر کا مسلم معاشرہ ایک ایسی شخصیت کی رہنمائی میں تھا جو اسلام کی حقیقی شان و شوکت کی بحالی کی طرف پیش رفت کر رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی گب اقبال کو ایک ایسا مفکر قرار دیتے ہیں جو مغربی تہذیب و ثقافت کا بہت مضبوط دفاع کرنے والا ہے جس سے کہ انہوں نے بہت اثر بھی قبول کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کے مختلف اداروں پر اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔

گب کے نقطہ نظر کی دوسری جہت یہ ہے کہ یہاں وہ علامہ اقبال کی اہمیت کو اور ان کے بیان کیے گئے بیانات اور تصورات کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تبھی تو وہ علامہ اقبال کے تصورات اور نظریات کو باہم متناقض اور التباسات اور تضادات کا شکار قرار دیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب میں دو مقامات پر بیان کیا ہے۔

ایک وہ مقام جہاں گب نے علامہ اقبال کے تضادات اور التباسات کے حوالے سے لکھا کہ علامہ اقبال نے برصغیر کے داخلی علمی اور فکری انتشار اور کشمکش میں اپنی فکری کاوشوں کے ذریعے اضافہ کیا اور دوسرا جب وہ اقبال کے تضادات بیان کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے جب مسلم علم الکلام کی تشکیل نو کی کوشش کی تو اس کا اختتام انہوں نے صوفیانہ الٰہیات کی تشکیل پر جا کر کیا اس طرح ان کے نزدیک اقبال کی علمی کاوشیں فکری الجھاؤ پر جا کر ختم ہوئیں اور تیسرا وہ مقام جہاں پر وہ اقبال کے حاصلات فکر کو ناپختہ قرار دیتا ہے اور انہیں ہمیشہ غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گب بار ہا اس بات کو بیان کرتا ہے کہ علامہ اقبال کے *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں بیان کیے گئے خیالات صوفیانہ طریق کے وجدانی تجربے پر جا کر منتج ہوئے جو فی الاصل علامہ اقبال کی غیر منطقی رومانویت کے حامل مفکر ہنری برگساں کی طرف جھکاؤ کا نتیجہ ہے۔[۳۴]

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہملٹن کی یہ تمام بحث ایک استشراقی بیانیہ ہے جو ایک استشراقی ذہن سے برآمد ہوا ہے اور اس کی تصدیق ہر اس بات سے ہوتی ہے جو ایک مستشرق کے علم پر اس کے حاصلات، اندازوں، تاثرات اور نقطہ نگاہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ اسی لیے ہملٹن گب کا موقف متعصّبانہ، زیادتی اور جانبداری پر مبنی مطالعہ کا حامل ہے اور اس کی علامہ اقبال کے بارے میں تحریروں کو اسی تعصب کے تناظر میں پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب *Orientalism* میں بیان کرنے اور ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں اس نے ہملٹن گب کو ایک مکمل مستشرق کے طور پر پیش کیا ہے جس کا تعلق کلاسیکی استشراق سے ہے اور وہ اپنے آپ کو عرب امور کا ماہر کہنے کے بجائے مستشرق قرار دینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔[۳۵] ایڈورڈ سعید نے بھی اسے تعصب کا حامل مستشرق قرار دیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اسی نقطۂ نظر اور روش کو جدید اسلام کو سمجھنے کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے اور ہملٹن گب کو بھی اسلام دشمن کہا ہے اور اس کی اس روش پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہمیں اس واضح عناد کے ساتھ جدید اسلام کا سامنا کیوں کرنا چاہیے جیسا کہ ہملٹن گب کر رہا ہے۔[۳۶]

اس حوالے سے میں اپنے ایک مشاہدے کو قابل بیان سمجھتے ہوئے یہاں ضرور پیش کرتا ہوں کہ تحقیقی موضوعات اور علمی عنوانات کے لحاظ سے ہملٹن گب کی *Modern Trends in Islam* اور علامہ اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں علمی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور شاید علامہ اقبال کی کتاب اسلامی علوم کے ان مباحث کا احاطہ کرنے کے لحاظ سے ہملٹن گب کی کتاب *Modern Trends in Islam* ہی کی طرح ہے۔

مجھے اہل علم اور محققین میں سے کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس نے ان دونوں کے درمیاں اس طرح کی مماثلت پر توجہ دی ہو یا اس مماثلت کی نشاندہی کی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ مالک بن نبی نے اپنی کتاب *The Destination of Islamic World* اور گب کی کتاب *Modern Trends in Islam* میں کیا مماثلت دیکھی جبکہ اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ اسے اپنے اور علامہ اقبال کے علمی موقف کے حوالے سے کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔

اس حوالے سے بہت قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ مالک بن نبی (۱۹۰۵-۱۹۷۳ء/ ۱۳۲۲-۱۳۹۳ھ)[۳۷] نے گب کے تعصب کے ساتھ اپنی بہت قربت ظاہر کی ہے جو اس کی مذکورہ بالا کتاب میں نظر آتی ہے اور جس طرح سے اس نے علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کو تنقیدی انداز سے دیکھا ہے ایسے لگتا ہے کہ علامہ اقبال کے حوالے سے موقف طے کرنے میں وہ گب کے زیر اثر ہے۔ اور ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ مالک بن نبی نے کسی موقع پر علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی یا نظریات کی حمایت کی ہو۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مالک بن نبی کو علامہ اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ جب بھی اس نے اپنی کتاب *The Destination of Islamic World* میں مسلم دانش کی درجہ بندی کی ور اس میں جہاں کہیں بھی علامہ اقبال کا حوالہ دیا تو ان کی اصل کتاب سے حوالہ دینے کی بجائے انہی خیالات پر انحصار کیا جو علامہ اقبال کے بارے میں یا ان کی کتاب کے بارے میں ہملٹن گب نے اپنی کتاب میں

بیان کیے تھے بلکہ مالک بن نبی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں علامہ اقبال کے چھ خطبات کے جتنے حوالے دیے ہیں گب کی طرف سے اپنی کتاب میں دیے گئے حوالے اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

میرے مطالعے کے مطابق اگر تعصب سے بالا تر ہو کر دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی کتاب ہملٹن گب کی کتاب سے زیادہ گہری، استدلال کے لحاظ سے زیادہ ٹھوس اور باثروت ہے۔ میں یہ بات دونوں کتب کے تفصیلی مطالعے، ان کے متون کے تجزیے میں بیان کی گئی معلومات کے تنقیدی جائزے اور اس کی پیشکش کے انداز کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے جو نتائج فکر بیان کیے وہ ان نکات کا رد ہے جنہیں گب نے اپنی کتاب میں بار بار بیان کیا ہے اور علامہ اقبال کے موقف اور نظریات پر تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ گب نے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ علامہ اقبال نے بہت ہی اعلیٰ سطح پر شعر اور فکر کو اکٹھا کیا ہے کیونکہ انہیں بہت ہی اعلیٰ شعری ملکہ اور فکری استعداد سے نوازا گیا تھا۔ ایک طرف تو وہ بہت ہی باصلاحیت شاعر تھے جنہیں امتیازی شعری تجربہ حاصل تھا اور جس کا انہیں خوب ادراک بھی تھا تو دوسری طرف وہ بہت ہی اعلیٰ پائے کے مفکر تھے اور انہیں وہ فکری تجربات حاصل تھے جو انہیں بقیہ لوگوں سے نہ صرف ممتاز کرتے تھے بلکہ انہیں اس کا شعور بھی تھا بلکہ ان کی فکری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد فکری نے کہا کہ بیسویں صدی میں کوئی مفکر اس فکری رفعت تک نہیں پہنچا جو علامہ اقبال کو حاصل تھی۔[۳۸]

جب بھی گب علامہ اقبال کے نظریات کو زیر بحث لانا چاہتا ہے تو وہ ان کا تذکرہ یوں کرتا ہے کہ یہ علامہ اقبال کی وہ آواز ہے جو ہمیں اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل نو کے لیے ان کے چھ خطبات میں سنائی دیتی ہے۔[۳۹]

جہاں تک ہملٹن گب کی کتاب کے عربی ترجمے کا تعلق ہے اس میں مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا کہ گب نے علامہ اقبال کی کتاب کا نام بیان کیا ہو اگر اس نے کہیں انگریزی کتاب میں بیان کیا ہو تو اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔

دوسری طرف جہاں تک اقبال کی شاعری اور فکر کے متاثر کن ہونے کا تعلق ہے تو یہ معاملہ ہر طرح کے شک وشبہ اور تنازع سے بالاتر ہے۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری اور فکر اس قابل تھی کہ وہ اس کے ذریعے دنیا کو پیغام دے سکیں کہ وہ برصغیر پاکستان اور بھارت کی سرحدوں سے آگے نکل گئے حتیٰ کہ ان کا پیغام عرب دنیا، مسلم ممالک اور یورپ تک جا پہنچا جہاں سے ان کی فکر پر مبنی کتابیں اور ان کی شاعری کے ترجمے شائع ہوئے۔

علامہ اقبال کی کتابوں مثلاً اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ دیگر زبانوں میں تراجم سے بہت پہلے ہوا۔ علامہ اقبال نے یہ فارسی مجموعہ کلام ۱۹۱۵ء میں شائع کروایا تھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں ہوا جو معروف انگریزی مستشرق نکلسن نے کیا۔[۴۰] جبکہ اس کا عربی ترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا جو ڈاکٹر عبد الوہاب عزام (۱۸۹۴ - ۱۹۵۹ء/ ۱۳۱۱ - ۱۳۷۹ھ) نے کیا تھا۔ اور جسے عرب دنیا میں علامہ اقبال کے ادبی، فکری اور سوانحی تعارف کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔[۴۱]

اقبال کی فکر پوری دنیا تک پہنچ گئی اور وہ بھارت، پاکستان اور برصغیر کی سرحدوں تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ فکر عرب ممالک، اسلامی دنیا اور یورپی ممالک تک جا پہنچی۔

یہ متضاد بات بھی بار بار دہرائی جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی علمی اور فکری تحریریں عرب ممالک اور اسلامی دنیا میں عام ہونے سے پہلے یورپ پہنچ گئیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ *The Development of Metaphysics in Persia* جو علامہ اقبال نے میونخ یونیورسٹی جرمنی میں ۱۹۰۸ء میں پیش کیا تھا انگریزی زبان میں ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔ جس کے لیے علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں ایک خط بھی لکھا تھا اور اس کے ساتھ ان کے انگریزی اساتذہ کی سفارش بھی شامل تھی۔

جبکہ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا اردو ترجمہ فلسفہ عجم کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ایک ہندوستانی مصنف میر حسن الدین نے کیا تھا جو علامہ اقبال کے علم میں تھا اور ان کی اجازت کے ساتھ شائع کیا گیا۔ جبکہ ان کے اس مقالے کا عربی ترجمہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا جو حسین مجیب المصری (۱۹۱۶-۲۰۰۴ء/ ۱۳۳۵ - ۱۴۲۵ھ) نے کیا تھا۔[۴۲] اور اس پر انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۷۷ء میں اقبال میڈل سے بھی نوازا گیا تھا۔

علامہ اقبال کے عالمی سطح پر اعترافِ عظمت کے حوالے سے یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف جرمن نے بھی کیا اور انہوں نے علامہ اقبال سے اپنی وابستگی کے اظہار کے لیے میونخ یونیورسٹی میں ایک یادگار قائم کی جس پر علامہ اقبال کا نام اور ان کے لیے اہلِ جرمن کے تحسینی کلمات لکھے ہوئے ہیں۔ اور اکثر وہ علامہ اقبال کا تقابل معروف جرمن شاعر گوئٹے (۱۷۴۹ - ۱۸۳۲ء) کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات وہ اقبال کا تقابل معروف جرمن فلسفی نٹشے (۱۸۴۴-۱۹۰۰ء) کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کی کچھ کتابوں اور تحریروں کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے اور وہ علامہ اقبال کو ایک عظیم فلسفی سمجھتے ہیں۔

جب بھی کسی شخصیت میں شاعری کی صلاحیت اور فکر کی استعداد اکٹھی ہو تو اس سے اس شخصیت میں غیر معمولی توازن پیدا ہوتا ہے اور اس کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ شعری استعداد تخیل کی پرواز کو

بلند تر اور آفاقی کرتا ہے جبکہ فکر کی استعداد بصیرت اور حکمت کو وسیع کرتی ہے۔ شاعری میں قوت فصاحت و بلاغت سے پیدا ہوتی ہے جبکہ فکر سے معنی کو طاقت، قوت اور تاثیر ملتی ہے۔ شاعری کا ہنر ہمارے ضمیر کو جگاتا ہے اور فکر کا ہنر ذہن انسانی کے ایوانوں میں روشنیاں پیدا کرتا ہے۔ شاعری کی خداداد صلاحیت عامۃ الناس کو متاثر کرنے کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے سے عام لوگوں تک جب فکر پہنچائی جائے تو وہ براہ راست ان کے کردار تک اثر انداز ہوتی ہے۔

ان دو اعلیٰ صلاحیتوں اور استعدادوں نے علامہ اقبال کو فکری طور پر نہ صرف مضبوط کیا بلکہ اعلیٰ علمی مقام پر بھی فائز کر دیا۔ ان کی شعری صلاحیت نے ان کے حلقہ اثر کو بڑھایا اور اس سے ان کو کثیر عوام کی توجہ حاصل ہوئی جبکہ ان کے علمی کام، فکری کارناموں اور فلسفیانہ غور و فکر اور اس کے حاصلات نے ان کے فکری مقام کو مضبوط کیا اور اہل علم کی توجہ ان کی فکر اور فلسفے کی طرف مبذول ہوئی۔ ہمارے لیے یہ غور و فکر کا معاملہ یا موقعہ ہے کہ علامہ اقبال نے ان دونوں صلاحیتوں کو استعمال کر کے کس طرح یہ عظیم مقام حاصل کر لیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال روحانیت اور عقلیت میں کوئی تضاد پیدا کیے بغیر یا ان میں سے کسی کا انکار کیے بغیر ان دونوں رجحانات کو جمع کر لیتے ہیں۔ ایک طرف وہ واضح روحانی رجحان رکھتے ہیں جو ان کی زندگی، رویوں، فکر اور علمی کارناموں سے ظاہر ہے جبکہ دوسری طرف وہ ایک واضح عقلی مزاج اور فکر کے حامل ہیں جو ان کی فلسفیانہ سوچ میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کی کتابوں، تصانیف اور ان کی فکر کو اس طرح الگ الگ حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا جہاں ان کی فکر اور تصانیف میں روحانیت اور عقلیت کو الگ کیا جا سکے۔ علامہ اقبال کی شخصیت میں روحانیت کا رجحان بہت نمایاں ہے اور ان کی پوری زندگی میں رواں دواں نظر آتا ہے حتیٰ کہ ان کی تصانیف اور فکر کو صرف عقلی سند یا روحانی سند میں تقسیم یا محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ علامہ اقبال کی روحانیت کو بیان کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے بچپن ہی سے اس رجحان کے ساتھ اپنے خاندان میں پلے بڑے اور یہ رجحان ان کی ذات کا حصہ بن گیا۔ انہیں روحانیت کا ذوق اپنے والد شیخ نور محمد کے زیر اثر حاصل ہوا جو ایک پختہ صوفی رجحان رکھنے والی شخصیت کے طور پر مشہور تھے اور یہ رجحان علامہ اقبال کے ساتھ زندگی بھر رہا۔ انہوں نے بچپن ہی میں اپنے والد گرامی کی صحبتوں میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰ء/ ۵۶۰- ۶۳۸ھ) کی کتابوں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے دروس سنے۔ اور یہ دروس زندگی بھر علامہ اقبال کی یادداشت کا حصہ رہے حتیٰ کہ تصوف ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔

علامہ اقبال جب اپنے ابتدائی سوانح کے واقعات بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی مذمت نہیں کرتا۔ میرے والد وہ صاحب علم شخصیت تھے جنہیں شیخ اکبر کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے مباحث میں مہارت حاصل تھی اور میں نے ان کتابوں کے نام سب سے پہلے اس وقت سنے جب میں صرف چار سال کا تھا اور ابھی پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ دونوں کتابیں سالہا سال سے ہمارے گھر میں موجود تھیں اگرچہ میں ان کتابوں کو یا ان کے مباحث کو بچپن میں سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن میں ان درس کے حلقوں میں ضرور موجود ہوتا تھا اور پھر جیسے جیسے عربی زبان میں میں نے مہارت حاصل کی میں ان دونوں کتابوں کو سمجھنے بھی لگ گیا اور اس طرح مجھے ان دونوں کتابوں کے بارے میں زیادہ علم اور تجربہ حاصل ہوتا گیا اور ان کتابوں کے بارے میں زیادہ علم حاصل کرنے کی طلب اور آرزو بھی میرے دل میں پیدا ہو گئی۔[۴۳]

علامہ اقبال کی شخصیت میں یہ روحانی رجحان اس وقت بھی موجود رہا جب انہوں نے یورپی فلسفہ بہت گہرائی کے ساتھ پڑھا اور اس میں مہارت حاصل کی اس وقت انہوں نے کہا کہ میں اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے تصوف کی طرف میلان رکھتا ہوں کیونکہ یہ میلان میں نے اپنے آباء واجداد سے ورثے میں پایا ہے اور یہ رجحان یورپی فلسفہ پڑھنے کے بعد مزید پختہ ہوا ہے۔[۴۴]

اس وقت بھی جب تصوف کے حوالے سے علامہ اقبال کا موقف تبدیل ہوا ان کی شخصیت میں روحانیت کا یہ ذوق اور رجحان کم نہیں ہوا جب انہوں نے صوفیا میں متداول وحدت الوجود پر سخت تنقید کی اور اسے مسترد کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تصور توحید کے خلاف ہے اور جب انہوں نے اس تصور کو مسترد کرتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی اور اسے نفی ذات، خودی کے استہلاک اور بے عملی سے تعبیر کیا جو صوفیا کے لٹریچر اور رویوں میں نظر آ رہا تھا اور انہوں نے وحدت الوجود کے اس فلسفے کو عملیت اور عملی زندگی کے فلسفے سے متصادم قرار دیا اور اس کا اظہار اپنی کتاب اسرار خودی میں کیا جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب نے اپنے زمانے کا سب سے بڑا علمی اور ادبی معرکہ شروع کیا جس کے ساتھ تنقید کی ایک بڑی لہر اٹھی کیونکہ علامہ اقبال نے ایرانی شاعر حافظ شیرازی (۱۳۲۵-۱۳۸۸ء/۷۲۶-۷۹۱ھ) اور اس کی صوفیانہ شاعری کے خلاف سخت تنقیدی نقطہ نظر اپنایا تھا۔ جہاں تک علامہ اقبال کے عقلی رجحانات کا تعلق ہے یہ ان کے فلسفیانہ سوچ، فلسفیانہ تجزیوں اور جدید یورپی فلسفے کے ساتھ گہری وابستگی سے واضح ہے۔ اس کے تحت علامہ اقبال نے عقل کو اور عقلیت کے منہج اور راستے کو بہت بڑی حد تک ذہن انسانی کے لیے ایک فیصلہ کن عنصر قرار دیا اور بتایا کہ ذہن انسانی کی آخری فتح عقل ہی کی فتح ہے۔

علامہ اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں

روحانیت اور عقلیت کا اعتدال اور امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے فلسفے کو بہت شفاف، نہایت موزوں اور مرتب انداز سے مکمل کر دیا۔ کیونکہ وہ مشرق اور مغرب کے فلسفے کے درمیان کھوئے گئے اعتدال اور توازن کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ مغرب کا فلسفہ جو کلیتاً عقلیت پر مبنی تھا اور روحانیت سے خالی تھا اسے اعتدال حاصل کرنے کے لیے روحانی رجحانات حاصل کرنے کی ضرورت تھی اور مشرق کا فلسفہ جو روحانی مزاج کا حامل تھا، اسے اعتدال سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جدید عقلی رجحانات سے آشنا کروایا جائے۔

مسلم علمی دنیا میں اس حقیقت اور علامہ اقبال کے حصول اعتدال و توازن کی کوشش کی اہمیت اور قدر و قیمت اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب ہم اس واضح تقسیم سے آگاہ ہوں جو امام غزالی اور ابن رشد کے درمیان مسلم فکر کے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے دوران پیدا ہوا۔ غزالی روحانی رجحانات میں فاتح تھے جبکہ ابن رشد کو عقلی رجحانات میں برتر مقام حاصل تھا۔ علم کے نتیجے میں اسلامی فکر دو واضح طبقوں میں تقسیم رہی۔ کچھ مفکرین امام غزالی اور اس کے روحانی رجحانات کے طرف دار ہوئے اور کچھ ابن رشد اور اس کے عقلی رجحانات کے پیروکار بنے اور ان دونوں کے درمیان وہ اپروچ مسلسل معدوم رہی جو ان دونوں رجحانات کو ملا سکتی اور ان کے درمیان دوری کا خاتمہ کر سکتی۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال کو دیگر قدیم اور جدید مسلم فلسفیوں کے مابین دور جدید کے نمایاں ترین مسلم فلسفی کا مقام حاصل ہے۔ دوسری یہ کہ علامہ اقبال محض محقق یا فلسفے کے استاد نہیں تھے یا دوسروں کے فلسفے کے نقال نہیں تھے کہ ان کے بیان کیے ہوئے فلسفوں کو ہی بہتر انداز میں بیان کرتے چلے جائیں۔

علامہ اقبال نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کا فلسفہ علم اور حکمت کی گہرائیوں کو کھوجنے اور تحقیق کرنے کی بیس سالہ مشقت کا نتیجہ ہے جس دوران انہوں نے دنیا کے فلسفیوں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ان پر غور وفکر کیا اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے فکری اور روحانی جدوجہد کی۔ اور جو نقطہ نظر انہوں نے اختیار کیا اس کے دفاع کے لیے استدلال فراہم کیا اور مسلم اور مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے افکار پر سوالات بھی اٹھائے۔

علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کی تشکیل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس کے ذریعے سے ہی وہ ایک انتہائی پرتاب اور غالب فلسفے تک پہنچے جو سنجیدہ اور گہری خصوصیات کا حامل ہے اور دوسرے فلسفیوں خصوصاً مغربی فلسفیوں میں انہیں ایک خاص پہچان حاصل ہوئی اور ان کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ انہوں نے اقبال کی فکر میں دلچسپی بھی لی۔ علامہ اقبال کے پیش کردہ فلسفے میں ان کے تین طرح کے تجربات موجود ہیں جن تجربات پر انہوں نے ایک طویل عرصے تک غور کیا ان کا ذوق حاصل کیا اور ان کے

مشاہدے سے گزرے۔ یہ تین طرح کے تجربات یہ ہیں: روحانی تجربہ، شعری تجربہ اور فلسفیانہ تجربہ۔

ہر وہ فلسفہ جو ان تین طرح کے تجربات سے گزرتا ہے ایک طرف تو اسے علمی اور فکری ثروت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اس میں درجہ اتمام و کمال اور ربط باہمی پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح علامہ اقبال کے فلسفے کو دوسرے فلسفوں پر فوقیت اور امتیاز حاصل ہو جاتا ہے جو ان تینوں طرح کے تجربات میں سے کسی ایک تجربے سے بھی خالی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر تجربہ اپنا ایک تسلسل، ذوق اور امتیاز رکھتا ہے۔ اور اس کی اپنی تاریخ، ابلاغ، غالب اثرات، چمک اور انکشافات ہیں۔

مزید برآں اسلام کے دور جدید میں علامہ اقبال ان چند مفکرین کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے اپنی فکر و فلسفہ میں قدیم و جدید فلسفیوں جن میں مسلم اور یورپی فلسفی شامل ہیں، کو بطور حوالہ بیان کیا ہے۔ یہی کام کچھ عرب اور مسلم محققین نے بھی کیا ہے اور اس دائرہ کار میں رہتے ہوئے ڈاکٹر عثمان امین (۱۹۰۵-۱۹۸۷ء) نے علامہ اقبال اور جرمن فلسفی کانٹ کا تقابل کیا ہے۔ ان کے مطابق اسلامی فکر کی تاریخ میں اقبال نے وہی کارنامہ انجام دیا ہے جو کارنامہ مغربی فکر کی تاریخ میں کانٹ نے انجام دیا تھا۔[۴۵]

اسی تسلسل میں ڈاکٹر ماجد فخری نے اقبال کا تقابل ابو حامد الغزالی سے کیا ہے کیونکہ علوم، افکار اور فلسفے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے باب میں اقبال نے اپنی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں جس درجے کا علمی کارنامہ انجام دیا یہ ویسے ہی ہے جیسے ایک ہزار سال پہلے الغزالی نے اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے احیاء علوم الدین میں انجام دیا تھا۔[۴۶]

۴۔ چوتھا پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال ایسے مفکر کی ایک مثال ہیں جنہوں نے ہر طرح کے فلسفے کو پڑھتے ہوئے اپنی شناخت کو محفوظ رکھا اور اپنی شناخت سے بیگانہ نہیں ہوئے۔ وہ ایک ایسے مفکر ہیں جن کی ابتدائی محبت اور وابستگی فلسفہ کے لیے تھی جس کے باعث وہ فلسفے کے مطالعہ کے لیے برطانیہ اور جرمنی کی یونیورسٹیوں تک گئے۔ وہاں انہوں نے جدید یورپی فلسفوں کو بہت گہرائی سے پڑھا اور اپنے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ اپنے علم کو پختہ کیا اور ان کے یورپی اساتذہ نے بھی انہیں ایک ایسے ذہین طالب علم کے طور پر پایا جو بہت زیادہ توجہ اور علمی تربیت کے اہل تھے۔

یورپ کے فلسفیوں سے رابطہ اقبال کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی کیونکہ وہ طویل مدت تک انگریز مستشرق تھامس آرنلڈ (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) کے ساتھ رہے ہیں اور یہ رفاقت ہندوستان سے برطانیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کے زمانے سے شعبہ فلسفہ میں آرنلڈ کے طالب علم تھے۔ جہاں ڈاکٹر آرنلڈ ۱۸۹۸ء میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ برطانیہ اور جرمنی میں جہاں اقبال نے

ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کی اور تین سال تک ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تک رہے اس دوران بھی اور حتی کہ یورپ سے واپسی کے بعد بھی ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر آرنلڈ کی وفات تک علامہ اقبال کا ان سے تعلق قائم رہا۔

اس باہمی تعلق کے اثرات بیان کرتے ہوئے جاوید اقبال نے لکھا کہ ڈاکٹر آرنلڈ نے علامہ اقبال کے فلسفیانہ ذوق کو ابھارا اور انہیں اس طرف ترغیب دی کہ وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے یورپ جائیں۔ یونیورسٹی آف کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں انہیں داخلہ ملا۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے وہاں انہیں رہائش کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈنے میں بھی مدد دی اور ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کو لندن سے ۱۹۰۸ء میں طبع کرایا۔ جس میں اس کتاب کا انتساب بھی ڈاکٹر آرنلڈ کے نام کیا گیا تھا۔ اسی طرح اور کئی پہلو بھی ان دونوں کے باہمی تعلقات کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔[۴۷]

اس طرح علامہ اقبال کے لیے یہ آسانی پیدا ہوگئی کہ وہ مغربی فکر میں مہارت حاصل کر لیں اور یورپی تہذیب کو سمجھنے والے بہترین صاحب دانش بنیں۔ یہ صورتحال بہت سے عرب اور اسلامی دنیا کے اہل علم کے ساتھ ہے جو علامہ اقبال جیسے ہی تجربے سے گزرے کہ وہ مغربی فکر کو سمجھنے کے بعد اسلام اور اسلام کے نظریات کے بارے میں اپنے تصورات اور فلسفہ کو منظّم کر کے پیش کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال اس لحاظ سے بہت واضح تھے۔ نہ صرف مسلمانوں اور مسلم دنیا کے سامنے بلکہ خود یورپین اور امریکن کے سامنے بھی علامہ اقبال ایک دینی مفکر تھے جو یورپی فلسفیوں اور تہذیب کے بارے میں وسیع علم، معلومات اور فہم کے حامل بھی تھے۔

پانچواں پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان چند مفکرین میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے طور پر قرآن مجید کو اپنا ماخذ بنایا۔ ایسا ماخذ جس سے کبھی تو وہ فکر اخذ کرتے ہیں اور کبھی قرآن مجید کی آیات کو اپنی کسی فکر کی دلیل کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کبھی وہ کسی اور فکر کو بیان کرنے کے لیے قرآن مجید سے استدلال لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں علامہ اقبال نے بہت سے ایسے اخلاقی، فکری اور فلسفیانہ افکار پیش کیے ہیں جو انہوں نے قرآن مجید سے اخذ کیے ہیں اور یہ وہ افکار ہیں جو ہمیں ان کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں بہت واضح طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

اہل علم میں سے اکثریت جنہوں نے علامہ اقبال کی کتاب کو پڑھا ہے انہوں نے اس خصوصیت کو بہت وضاحت کے ساتھ دیکھا ہے کہ علامہ اقبال اس پر استقامت سے قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے افکار میں ان کے اس پہلو کو الگ سے ایک خصوصیت کے طور پر زیر بحث لانا ممکن ہوا ہے کیونکہ علامہ اقبال نے یہ کوشش کی کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں اپنے افکار بیان کریں اور اپنے نقطہ نظر کو سامنے لائیں۔

اس سلسلے میں انہوں نے قدیم اور جدید مفسرین قرآن کے افکار میں سے کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی مفسر کے ساتھ قرب یا بعد کے کسی بھی درجے پر وابستہ کرتے ہیں اور شاید وہ اپنے اس منشا کے اظہار کے بغیر ارادی طور پر ایسا کرتے ہیں۔

اور جب ہم علامہ اقبال کے اس امتیاز کو مرکز توجہ بناتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں عرب اور مسلم دنیا کے اہل علم اور مفکرین کی بڑی تعداد میں اس طرح کی کوئی دلچسپی یا پہلو نظر نہیں آتا جو ایک لحاظ سے اپنی عملی کاوشوں سے یہ بات سچ ثابت کر رہے ہوتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید کو ایک متروک کتاب کے طور پر لیا ہے۔

علامہ اقبال کو پختہ یقین ہے کہ قرآن مجید ہی ان کے ذاتی فلسفے کا ماخذ اور سرچشمہ ہے اور قرآن مجید ہی ان کے فلسفیانہ افکار اور فلسفیانہ تشکیل کا ماخذ اور بنیاد ہے اور اسی ماخذ نے ان کے صوفیانہ طریق اور فکر کی اصلاح کی ہے۔

چھٹا پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال کو نشاۃ نو اور اصلاح کے دور کی نمائندہ شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ تاثیر اور علمی کام اور غالب ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کا نمایاں فکری رجحان اسی چیز کی شہادت دیتا ہے مزید برآں علامہ اقبال کو صرف برصغیر پاک و ہند کی نشاۃ نو اور اصلاح کی شخصیت نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کی نشاۃ نو اور اصلاح کی تاثیر ان کے لٹریچر، تصانیف، فکر اور تحریک کے ذریعے سے مسلم دنیا کے دور دراز ممالک تک پھیل گئی ہے۔

علامہ اقبال کے احیائے ملت اسلامیہ اور اصلاح ملت کے افکار کے حوالے سے ان کے فرزند جاوید اقبال اپنے والد کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ اقبال اس وقت اپنے افکار کے حوالے سے ایک فکری انقلاب سے گزرے جب وہ کیمبرج میں تھے اور جب انہوں نے ۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی میں اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ جمع کرایا۔ اسی دوران علامہ اقبال کو یہ سوال درپیش ہوا کہ مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کے اسباب کیا ہیں؟

یہی نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے جاوید اقبال نے ہندوستانی مصنف اکرام الحق سلیم کی اس رائے پر انحصار کیا ہے جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ اقبال نے کیمبرج کے ایک انگریزی میگزین کے لیے ایک اسلامی سیاست پر ایک مضمون تیار کرنا تھا۔ اس دوران ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کے پیچھے کون سے نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اقبال نے کئی حوالہ جات کا جائزہ لیا۔ لیکن وہ کسی شافی اور اطمینان بخش نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اس لمحے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے زوال اور ان کی تہذیب کی پسماندگی کے اسباب تلاش کرنے کے لیے سنجیدہ تحقیق

شروع کر دی اور یہ دریافت کرنے کی جدوجہد شروع کر دی کہ حقیقی اسلامی نشاۃ نو کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔[۴۸]

جاوید اقبال کے مطابق یہ وہ تبدیلی تھی جس نے علامہ اقبال کی شاعری کو فیصلہ کن اور حتمی طور پر اسلام کی طرف موڑ دیا۔ ہندوستانی مصنف خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ کے مطابق جو یوں لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنی ذات میں ایک فیصلہ کن راستہ اختیار کر لیا، ایک واضح فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی کے دن ایسی شاعری لکھنے میں گزاریں گے جس کا مقصد اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوگا اور وہ کہا کرتے تھے کہ یہ ان کے والد گرامی کی تمنا تھی جنہوں نے ہمیشہ انہیں نصیحت کی کہ وہ اپنی زندگی اور شاعرانہ صلاحیت اسلام کے لیے وقف کریں اور اسلام کی خدمت کریں۔[۴۹]

غالباً یہ وہ نمایاں خصوصیات اور عوامل ہیں جن کی وجہ سے علامہ اقبال کو علمی اور فکری تاریخ میں اعلیٰ تر اور نمایاں مقام حاصل ہوا۔

❁...❁...❁

# حوالہ جات وحواشی

۱- جاوید اقبال: ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سیالکوٹ میں علامہ محمد اقبال اور ان کی دوسری اہلیہ سردار بیگم کے ہاں پیدا ہوئے، ان کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ۱۱ سال کے تھے، اور ان کے والد کا انتقال ۱۹۳۸ء میں اس وقت ہوا جب وہ ۱۴ سال کے تھے۔ وہ شاعر فلسفی علامہ محمد اقبال کے بیٹے ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا، جاوید نے قیام پاکستان کی تحریک اور سیاسی نظریے پر مختلف کتابیں تصنیف کیں، فلسفے کے علاوہ جاوید سپریم کورٹ آف پاکستان کے سینئر جج تھے۔ سپریم کورٹ میں جانے سے پہلے لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس تھے۔ وہ بین الاقوامی اور قومی جرائد میں فلسفہ، قانون اور جدید اسلامی فلسفہ میں اپنی مقبول اشاعتوں کے لیے بین الاقوامی سطح پر جانے جاتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ہوا۔

http//:en.dailypakistan.com.pk/ headline/ allama-iqbals-son-javed-iqbal-passes-away/

۲- جج جاوید اقبال کا انتقال، الفجر (اخبار)، اکتوبر ۴، ۲۰۱۵ء۔ بازیافت شدہ اکتوبر ۲۱، ۲۰۱۹ء، اقبال، جاوید، زندہ رود، شاعر مشرق اور شاعر اسلام کی زندگی پر تصنیف، علامہ محمد اقبال (ترجمہ)، المجلس الاعلیٰ للثقافۃ، القاہرہ، ۲۰۰۵ء، (۲/۲۲۶)۔

۳- گب ہیملٹن (۱۳۱۳-۱۳۹۱ھ/ ۱۸۹۵-۱۹۷۱ء) ایک مشہور انگریز مستشرق تھا، جو مصر کے شہر اسکندریہ میں پیدا ہوا اور آکسفورڈ میں انتقال ہوا۔ اس کا عرب دنیا سے گہرا تعلق تھا، وہ دمشق میں عرب سائنسی اکیڈمی کا رکن اور قاہرہ میں

عربی زبان اکیڈمی کا رکن، اس نے عربی ادب، اسلامی تاریخ اور جدید اسلامیات کے شعبوں میں بہت سی کتابیں اور تراجم شائع کیے۔

۴- محمد البہی: (۱۹۰۵-۱۹۸۲ء)، جدید دور میں اسلام کے مفکرین میں سے ایک اہم شخصیت، اس نے اصل کی طرف لوٹنے اور مذہبی اصلاح پر زور دیا، اور اسلامی فکر کے آغاز سے لے کر عصر حاضر تک پر تحقیق کی۔ اس کا موازنہ دوسرے فکری مکاتب فکر سے کیا۔ مخالف نظریات کا مقابلہ، استعماریت اور اسلامی معاشروں میں اس کے کردار کو بے نقاب کرتے ہوئے، البہی نے کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا جس نے اسلامی فکر اور اسلامی ذخیرہ علم کو تقویت بخشی۔

۵- دیکھیں: البہی، محمد، الفكر الإسلامی الحدیث وصلة بالاستعمار الغربی، مكتبة وهبة، القاهرة، مصر" الطبعة الرابعة (د.ت).

۶- مرتضی مطہری (۱۹۱۹ - ۱۹۷۹ء) ایرانی ماہر الٰہیات، اسلامی فلسفی، مفکر اور مصنف۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریہ سازوں میں سے تھے۔ وہ اسلامی مفسر اور فلسفی محمد حسین طباطبائی کے سب سے ممتاز طالب علموں میں سے ہیں، جو اسلامی بنیاد پرست، نظریاتی اور فلسفیانہ کاموں کے وسیع نیٹ ورک کے مالک ہیں۔ اسلامی علوم کی مختلف شاخوں پر ان کی بہت سی کتابیں ہیں اور ان کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مطہری کو ایران میں اسلامی انقلاب کے بااثر ارکان اور اس کے قائدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہیں انقلابی کمانڈ کونسل کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ایرانی حکومت نے ان کے یوم شہادت کو ایران میں یوم اساتذہ کے طور پر منایا۔

۷- فضل الرحمٰن: (۱۹۱۹-۱۹۸۸ء) ایک عظیم پاکستانی اسلامی مفکر جنہوں نے اپنی وفات کے بعد ایک ایسی وراثت چھوڑی جس پر آج بھی بیشتر مغربی یونیورسٹیوں اور بین الاقوامی ثقافتی فورمز پر بحث اور تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

۸- ہمارے پاس جو دستیاب ہے وہ درج ذیل اشاعت ہے، الرحمٰن، الإسلام وضرورة التحديث: نحو إحداث تغيير في التقاليد الثقافية، (تر) ابراہیم العریس دار الساقی، الطبعة الأولی، ۱۹۹۳ء

۹- ان کی کتاب *Modern Trends in Islam* ان کی سب سے مشہور کتابوں میں سے ایک ہے، گو وہ ان کے شعبے میں سب سے زیادہ مشہور نہیں ہے۔ یہ کتاب اسلامی فکر کے راستوں اور اس کے اندر پیدا ہونے والے ترقی کے رجحانات کی نوعیت اور ان راستوں پر مغربی افکار کے اثرات، اور یہ کہاں جا رہی ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے، کے مطالعہ اور تجزیہ میں گب کی دلچسپی کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ ?Islam to Where proceed یہ عنوان اس مواد سے لیا گیا ہے جس میں گب نے ۱۹۳۲ء میں جاری ہونے والی اس کتاب کی تدوین میں حصہ لیا تھا۔

اس دائرہ کار میں ان کی کتاب *The Islamic Society and the West* بھی آتی ہے، جسے انہوں نے ہیرالڈ بوون کے تعاون سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا، جب انہوں نے انیسویں صدی کے اوائل سے ترکی اور اس کے عرب ممالک پر مغربی افکار کے اثرات کا مطالعہ کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپی۔ اس طرح، اسلامی علوم کے میدان میں ان کی کچھ دوسری کتابیں بھی ہیں، جیسے کہ کتاب *The Renewal of Religious Thought in Islam* ۱۹۴۸ء میں شائع کی گئی اور کتاب *Islam: A Historical Surve* ۱۹۴۹ء میں شائع کی گئی ان کی کتاب *Studies on Islamic Civilization* ۱۹۶۲ء میں شائع کی گئی۔

کتاب *Modern Trends in Islam* اصل میں وہ لیکچرز ہیں جو گب نے ہاسکل انسٹی ٹیوٹ فار دی اسٹڈی آف کمپریٹیو ریلیجنز میں ۱۹۴۵ء میں دیے۔ یہ لیکچر اس پروگرام کے فریم ورک کے تحت دیئے گئے جو ریاستہائے متحدہ

امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں منعقد کیے گئے تھے۔ یہ پروگرام عام طور پر مذاہب میں مخصوص جہتوں اور رجحانات اور مختلف مذاہب کے درمیان ہونے والے تعلقات کی نوعیت کا مطالعہ کرنے کے لیے وقف ہے۔ دیکھیں: پیدائش، ہاملتون جیب والاتجاہات الحدیثۃ فی الإسلام، مجلۃ الکلمۃ، العدد ۵۰، السنۃ الثالثۃ عشرۃ، ۲۰۰۶ء

http//:kalema.net/home/article/list/667/1،2006

۱۰- ایڈورڈ سعید: فلسطینی محقق اور مصنف امریکی شہری۔ وہ ایک ادبی مفکر، یونیورسٹی کے پروفیسر اور ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے ادبی تنقید، موسیقی کی تنقید اور نوآبادیاتی مسائل کے بعد کے مسائل پر کئی کتابیں لکھیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں فلسطینیوں کے حقوق کے لیے مظاہروں میں حصہ لیا۔ اس نے چالیس سال تک کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی زبان اور تقابلی ادب کے لیے کام کیا، اور ۱۹۷۸ء میں کتاب *Orientalism* کی تصنیف کے لیے مشہور ہوئے۔ مغربی دنیا کے ان مفروضوں کے بارے میں بات کی جو مشرق بالخصوص مشرق وسطیٰ کی تہذیب کی علامتوں کے بارے میں غلط فہمی کا باعث بنتے ہیں۔ اس کتاب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور اسے سیاسیات کی کئی کلاسوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔

۱۱- سعید، ایڈورڈ، اورینٹلزم (ترجمہ) کمال أبو دیب، مؤسسۃ الأبحاث العربیۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء

۱۲- فوک، جوہان (۱۸۹۴-۱۹۷۴ء)، جرمن مستشرق۔

۱۳- فوک جوہان، *History of the Orientalist Movement, Arab and Islamic Studies in Europe*، جرمن سے نقل: عمر لطفی العالم، دار المدار الاسلامی، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۱ء۔ مستشرقین کی تحریک، جس طرح یہ مشنری مقاصد کے لیے ایک مذہبی ردِّعمل کے طور پر پیدا ہوئی، مسلمانوں کے مشرق کے ساتھ پہلے رابطے میں ان کی شکست کے بعد، چرچ نے مستشرقین سے مطالبہ کیا کہ وہ مذہب کے تشخص کو مسخ کریں تاکہ مغرب متاثر نہ ہو۔ پھر یہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اس تحریک اور چرچ کے مشنری مقاصد کے درمیان علیحدگی کی بات ہوئی، اور یہ ایک واحد شعبہ علم بن گیا، اور یہ کتاب ہمیں اسلام کے ظہور کے بعد سے لے کر پچھلی صدی کے وسط تک یورپ میں عربی علوم کے بارے میں بتاتی ہے جو کہ ایک بہت طویل عرصہ ہے، لہٰذا یہ طویل داستان تھی اور اس میں مستشرقین اور ان کی پیروی کرنے والے مکاتب فکر کے بہت سے نام اور شخصیات، جو کتابیں اور تحقیق انھوں نے کی ہے، اور جن حوالوں پر انھوں نے اپنی تحقیقات میں انحصار کیا ہے، پر مشتمل ہے۔ ہمیں مخطوطات میں ان کی تحقیق کے بارے میں بھی بتاتا ہے۔

۱۴- گب اور بوون ہرولڈ، *The Islamic Society and the West*، ترجمہ عبدالمجید القیسی، دار الہدی، دمشق، ۱۹۹۷ء، (۱/۱۷)

۱۵- عبدالرحمٰن بدوی (۱۹۱۷-۲۰۰۲ء) قاہرہ میں، بیسویں صدی میں فلسفے کے سب سے ممتاز عرب پروفیسروں میں سے ایک، کیونکہ ان کے کاموں میں تحقیق، ترجمہ اور تصنیف پر مشتمل ۱۵۰ سے زائد کتابیں شامل تھیں۔ فلسفے میں دلچسپی رکھنے والے کچھ عرب اسے پہلا مصری وجودی فلسفی مانتے ہیں، جو کہ بعض یورپی وجودیت پسندوں سے بہت متاثر ہے ان میں سرفہرست جرمن فلسفی مارٹن ہائیڈیگر ہے۔

۱۶- بدوی، عبدالرحمٰن، موسوعۃ المستشرقین، مؤسسۃ العربیۃ للدراسات والنشر، بیروت، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۴

۱۷- محمد عبدہ بن حسین خیر اللہ ۱۸۴۹ء میں ڈیلٹا کے علاقے بوحیرہ کے محلّہ نصر گاؤں میں ایک دیہی گھرانے میں پیدا ہوئے

اس دور میں جب کسان خاندان حکومت کی طرف سے عائد غیر منصفانہ ٹیکسوں اور قوانین کا شکار تھے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے اولین علمبرداروں میں سے ایک اور نظریہ اصلاح وتجدید کا حامی۔

۱۸- بدوی، عبدالرحمٰن، مستشرقین کا انسائیکلو پیڈیا، سابقہ حوالہ، ص:۱۷۴

۱۹- ہمارے پاس دستیاب اشاعت: تشارلز آدمس، الإسلام والتجدید فی مصر، (ترجمہ) عباس محمود، نظر ثانی شدہ أحمد زکریاء الشلق، المرکز القومی للترجمۃ، القاہرۃ، مصر، ۲۰۱۵

۲۰- تھامس واکر آرنلڈ (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) مشہور برطانوی مستشرق جس نے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیمبرج یونیورسٹی سے کیا، جہاں اس نے زبانوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، اس لیے اس نے عربی سیکھی اور علی گڑھ میں بطور محقق کام کرنے چلے گئے۔ جہاں اس نے دس سال گزارے۔ اس دوران انہوں نے اپنی مشہور کتاب (اسلام کی دعوت) لکھی، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر کے طور پر کام کیا، اور ۱۹۰۴ء میں وہ لندن واپس آکر پروفیسر بن گئے۔ برطانوی دفتر خارجہ کے ہندوستانی حکومت کے محکمہ کی لائبریری کے اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہے۔ ساتھ ہی وہ لندن یونیورسٹی میں جز وقتی پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے پہلے ایڈیشن کے ادارتی بورڈ کے رکن رہے یہ لیڈن، ہالینڈ سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مصری یونیورسٹی میں بطور وزٹنگ پروفیسر کام کیا۔ وہ ممتاز برطانوی مستشرق اور اسلامی فن کے مؤرخ تھے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی، پھر علی گڑھ کالج، اور گورنمنٹ کالج آف لاہور یونیورسٹی میں بھی رہے۔ وہ سرسید احمد خان کے دوست تھے اور انہوں نے اپنی مشہور کتاب *The Preaching of Islam* لکھی۔ وہ شاعر اور فلسفی محمد اقبال کے استاد تھے۔ وہ شبلی نعمانی کے بھی دوست تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد بھی تھے۔

۲۱- البہی محمد، الفکر الإسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی، مکتبۃ وہبۃ القاہرۃ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷۹

۲۲- گب کی کتاب *Modern Trends in Islam* اور محمد اقبال کی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* میں تحقیق کے موضوع، مسائل کی نوعیت اور فکری تناظر کے لحاظ سے کافی مماثلت ہے۔ دونوں کتابوں کے درمیان یہ مماثلت ہمیں گب کی کتاب میں پیش کردہ نظریات اور تصورات پر تنقید اور تجزیہ کرنے میں غور وفکر کے دائرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جس میں مجھے بغیر تعصب یہ نظر آتا ہے کہ اقبال کی کتاب گب کی کتاب سے زیادہ گہری، مضبوط اور بھرپور ہے۔ میں یہ الفاظ دونوں کتابوں کے ساتھ اپنے برتاؤ اور ان کی تحریروں کے تجزیے اور ان کے ساتھ علمی تنقید کی تشکیل کی وجہ سے کہتا ہوں اور یہ کہ اقبال نے جو کچھ تجویز کرنے کی کوشش کی ہے اس سے کئی بار انکار کیا ہے جو گب نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے نظریات اور مقالوں پر شک پیدا کرنا، چنانچہ ہیملٹن گب اپنی کتاب The Call to Renew Islam میں لکھتے ہیں کہ اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے سے اسلام میں تحریک کے اصول کا مؤثر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ محمد اقبال نے اپنی کتاب اسلام میں مذہبی فکر کی تجدید میں لکھا تھا۔ دیکھیں: ہیملٹن گب کی کتاب Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ۔

۲۳- گب، ہیملٹن، *Modern Trends in Islam*، (ترجمہ) ہاشم الحسینی، مکتبہ دار الحیات، بیروت، ۱۹۶۶ء، ص ۸۸

۲۴- m n p n.

۲۵- گب، ہیملٹن، *Modern Trends in Islam*، سابقہ حوالہ، صفحہ: ۸۹-۱۳۷۔

۲۶- ایضاً، صفحہ ۸۹-۱۳۷۔

۲۷- گِب، ہیملٹن۔ Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ، صفحہ ۲۰

۲۸- ہنری برگسان (۱۸۵۹-۱۹۴۱ء) فرانسیسی فلسفی، ۱۹۲۷ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ ہنری برگسان کا شمار جدید دور کے اہم ترین فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا اثر وسیع اور گہرا تھا۔ اس نے سوچ کا نیا رنگ اور اظہار کا نیا انداز عام کیا۔ انھوں نے پچاس کی دہائی میں پوری فکری تحریک پر اپنی چھاپ چھوڑی، اور اس نے ان اقدار کو بچانے کی کوشش کی جو مادیت پسند نظریے کے ذریعے ختم کر دی گئیں، اور روحانیت کی بطور ایک اٹل عقیدے کی تصدیق کی۔ اس کے فلسفے کو فرانس میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی حتیٰ کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے تا حال یہ طاقِ نسیاں کی نذر ہے۔ برگسان کی زبردست مقبولیت فرانس میں تنازع کا باعث بنی، جہاں حکام کی طرف سے ان کے خیالات کو سیکولر اور سائنسی موقف کی مخالفت کے طور پر دیکھا گیا۔

۲۹- گب، ہیملٹن، Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ، صفحہ: ۱۱۵-۱۵۱

۳۰- گب، ہیملٹن، Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ، ص: ۱۱۴

۳۱- ایضا، ص: ۱۱۶

۲۳- ایضا، ص: ۱۱۶

۳۳- گب، ہیملٹن، Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ، صفحہ: ۲۰-۸۹۔

۳۴- گب، ہیملٹن، Modern Trends in Islam، سابقہ حوالہ، ص: ۱۵۱۔

۳۵- سعید، ایڈورڈ، اورینٹلزم، (ترجمہ) کمال ابودیب، مؤسسة الأبحاث العربية، بیروت، ۲۰۰۱ء، ص ۸۳۔

۳۶- ایضاً، ص: ۱۱۶

۳۷- مالک بن نبی (۱۹۰۵-۱۹۷۳ء) بیسویں صدی کے ممتاز ترین اسلامی مفکرین میں سے ایک ہیں۔ الجزائر کے مفکر مالک بن نبی کو بیسویں صدی میں اسلامی فکری نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تہذیب کے بارے میں، جدید اسلامی فکر کی تشکیل اور تہذیبی مسائل کا عمومی مطالعہ کرنے میں مالک بن نبی کی کوششیں غیر معمولی تھیں، اس حوالے سے موضوعات کے تعین اور ان پر غور و فکر کی اپروچ اختیار کرنے میں وہ امتیازی مقام کے حامل ہیں۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلمانوں کے مسائل کو نفسیات، سماجیات اور تاریخ کی بنیاد پر جانچنے کے لیے ایک مخصوص نقطہ نظر پیش کیا۔

۳۸- فخری، ماجد، تاریخ الفلسفة الإسلامية منذ القرن الثامن حتى يومنا هذا، (تر) کمال الیازجی ماجد، دار الشروق، بیروت، ۲۰۰۰ء، ص ۵۴۱۔

۳۹- ایم این، ص ۱۰۹۔

۴۰- رینالڈ نکلسن (۱۸۸۶-۱۹۴۵ء) انگریز مستشرق جو تصوف اور فارسی ادب میں مہارت رکھتا تھا اور جلال الدین رومی کی شاعری کے بہترین مترجموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے مضامین انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاقیات اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہیں۔

۴۱- عبد الوہاب محمد حسن عزام کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز ترین عرب مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ پروفیسر، ادیب، مصنف، مفکر، شاعر، مترجم اور سیاست دان تھے۔

۴۲- حسنین مجیب المصری، ۱۹۱۶ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے، انہوں نے ۱۹۳۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے بیچلر آف آرٹس، ۱۹۴۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز سے ترکی اور فارسی علوم میں ڈپلومہ اور ۱۹۵۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آٹھ زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی میں شاعری کرتے تھے، انھوں نے قاہرہ اور شمس عین کی یونیورسٹیوں اور انسٹی ٹیوٹ آف عرب اسٹڈیز میں ترک ادب فارسی، تقابل ادیان، عثمانی تاریخ، ترکی کا مقبول ادب اور اسلامی تصوف پڑھایا۔ اب وہ عین شمس اور الازہر یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور قاہرہ میں عربی زبان اکیڈمی میں ماہر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

۴۳- اقبال، جاوید، زندہ رود، گزشتہ حوالہ، (۱/۱۱۵)۔

۴۴- اقبال، جاوید، زندہ رود، گزشتہ حوالہ، (۲/۱۸۶)۔

۴۵- بوعزیزی، محمد العربی، محمد اقبال، محمد إقبال فكره الديني والفلسفي، دار الفکر، دمشق، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۹۔

۴۶- فخری، ماجد، تاريخ الفلسفة الإسلامية منذ القرن الثامن حتى يومنا هذا، سابقہ حوالہ، ص ۵۳۴۔

۴۷- اقبال، جاوید، زندہ رود، گزشتہ حوالہ، (۱/۱۵۳، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۲۲)۔

۴۸- اقبال، جاوید، زندہ رود، گزشتہ حوالہ، (۲/۱۵۲-۱۵۳)۔

۴۹- اقبال، جاوید، زندہ رود، گزشتہ حوالہ، (۲/۹۱)۔